مثنوی رموزِ بیخودی — تنقیدی نظر[1]

سر عبدالقادر

> مثنوی رموزِ بیخودی یعنی ''اسرار حیات ملیہ اسلامیہ'' حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کے اہتمام سے یونین سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی۔ ابتدا میں علامہ سر محمد اقبال کا دو صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے اور چھوٹے سائز کے ۱۳۹ صفحات پر مشتمل متن۔ یہ کتاب پہلی بار چودہ سو کی تعداد میں چھپی۔ اس کا پہلا ایڈیشن پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی لیکن یہ امتیاز شاید کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لیے مثنوی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو جنھوں نے اس زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی اسرارِ خودی کے ذریعے سے پیغام عمل دیا ہے اور ''رمز بے خودی'' میں مژدۂ حیات سنایا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مولانا روم (علیہ الرحمۃ) کی ہے جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجے کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں اور ''قرآن در زبان پہلوی'' کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی زبان ایسی سلیس اور انداز بیان ایسا دل نشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالی شان مثنوی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں جن میں کلامِ الٰہی کے ضروری مسئلے جا بجا عام فہم پیرایے میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہب اسلام کی خدمت ہے۔ تصوف کا عنصر اس میں غالب ہے اور اس لیے یہ کتاب علما اور صوفیا دونوں میں مقبول ہے اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں طرزِ مثنوی مولوی معنوں کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ان دو مختصر مثنویوں کا مولانا روم کی عظیم الشان کتاب سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ نسبت ضرور ہے کہ اقبال نے مثنوی شریف کی شیریں زبان اپنی مثنویوں کے لیے اختیار کی ہے

اور مثنوی کی مقبول بحر تبرکاً اپنے لیے انتخاب کی ہے۔ جناب مولانا علیہ الرحمۃ کا فیض معنوی سمجھیے کہ ان دونوں مثنویوں میں ایک خاص تاثیر موجود ہے۔ ذیل کے اشعار میں اسرارِ خودی کی تمہید میں اقبال نے خود اس فیض کا اعتراف کیا ہے:

این قدر نظارہ ام بے تاب شد
بال و پر شکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کہ بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت: ''اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق
بر جگر ہنگامہ محشر بزن
شیشہ بر سر، دیدہ بر نشتر بزن
آشنائے لذت گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو

''درائے کارواں'' یعنی اقبال نے بیدار ہو کر اس ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ سوز و گداز خدا نے فطرت میں ودیعت کیا تھا، ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر پڑتے ہی وہ سوز و گداز نالہ نے کی طرح فریاد بن کر سینے سے نکلا اور پکارا کہ دنیا میں وہی افراد زندگی کا فرض کما حقہٗ ادا کرتے ہیں جو لذت عمل سے بہرہ یاب ہیں اور جو قوت عمل کھو بیٹھے یا محو خیال ہو بیٹھے ہوں ان کا شمار زندوں میں نہیں۔ اس ایک مضمون کو کئی پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے اور کئی تشبیہوں سے اور کئی مؤثر مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی کے لیے ایک بسیط ریویو جداگانہ درکار ہے جو پھر کبھی (اگر حالات مساعد ہوئے) لکھا جائے گا۔ اخبارات میں اس پر بہت لے دے ہو چکی ہے اور بہت کچھ اس کی تعریف میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت تو اس مثنوی کے دوسرے حصے سے بحث ہے جو حال میں شائع ہوا اور جس کا نام رموزِ بیخودی رکھا گیا ہے۔

اگر صرف دونوں مثنویوں کے ناموں کو سرسری طور پر دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ حضرت اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نکتہ چینی زبان قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملت اسلامی کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد زیست کے میدان میں مردانہ کارزار کے لیے تیار ہو اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بن کر وہی بے خودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب رموزِ بیخودی کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا

ہے۔ اوّل تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے رموزِ بیخودی میں ان اُصول سے بالکل انحراف نہیں کیا جو اسرارِ خودی میں اُصول زندگی قرار دیے گئے تھے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لیے خودی اور خودداری ذریعہ استواری ہے، وہی افراد کا اپنی ہستی، ہستی قومی میں محدکر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جز کو قومی زندگی کی کل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لیے لازم ہے اور اس کو بے خودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ بے خودی ہے جو خودداری اور خود شناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لیے عین نفع ہے۔ اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوتا ہے:

تو خودی از بے خودی نشاختی
خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو
یک شعاعش جلوۂ ادراک تو
خوگر پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد[۲]
پائے در ہنگامہ جلوت نہد

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گل برگ چمن گردد خودی

یہ اُصول ذہن نشین کرتے ہوئے شاعر مطلب کی طرف آتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ ربط افراد افراد کا نام ہی ملت ہے اور افراد کی ہستی کے قیام کا مدار اسی ارتباط پر ہے اور اس دعوے کی زبردست دلیل نیچر کا مشاہدہ ہے:

مدعائے ما، مآلِ ما یکسیت
طرز و انداز خیال ما یکسیت
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

قومی زندگی کی بنیاد یک دلی پر رکھ کر قومی خیالات کی تدبیروں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ پہلے تنبیہ کی ہے کہ یاس و نا اُمیدی، قومی زندگی کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ ترقی چاہنے والی قوموں کو چاہیے کہ نا

اُمیدی کو پاس نہ آنے دیں، حوصلے بلند رکھیں اور سرگرم جستجو رہیں۔ نا اُمیدی عموماً خوف سے پیدا ہوتی ہے یا غم سے اس لیے خوف اور غم سے بھی الگ رہنا چاہیے۔ اس ہدایت پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے مثنوی میں آیات و احکام قرآنی کے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شان ایمان کے خلاف ہے، اور جب بیم غیر اللہ سے نجات ہو تو کوئی کام ایسے آدمی کے لیے دشوار نہیں ہوتا:

بیم چوں بند است اندر پاے ما
ورنہ صد سیل است در دریاے ما

اس سلسلے میں ایک حکایت اورنگ زیب عالم گیر کی درج کی ہے جس پر جنگ میں نماز پڑھنے کی حالت میں شیر نے حملہ کیا مگر بادشاہ اس سے نہ ڈرا اور بغیر تاک کر ضرب لگانے کے اس نے خنجر کا ایسا وار کیا کہ شیر ہلاک کر دیا اور پھر مصروف نماز ہو گیا۔ اس حکایت کو نظم کرتے ہوئے اورنگزیب کی خدمات مذہبی کی تعریف کی ہے اور اس ساری تعریف کی جان یہ شعر ہے جو عالم گیر کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے کی بلاغت خصوصاً قابلِ داد ہے:

درمیان کار زار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

اس کے ملت اسلامی کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات بابرکت کی بدولت مضبوط ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما
کثرت ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود

پھر ملت اسلامیہ کی خصوصیات چند پر معنی شعروں میں بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ حریت اور مساوات اس ملت کی سرشت میں داخل ہے۔ اسلامی مساوات کی تمثیل کے طور پر ایک درد انگیز تاریخی روایت نظم کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ملک خجند کے رہنے والے ایک پردیسی معمار نے بنائی تھی۔ بادشاہ کو اس کی عمارت کچھ ناپسند ہوئی اور اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس معمار نے قاضی کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف استغاثہ کیا۔ بادشاہ عدالت میں طلب کیا گیا۔ قاضی نے مقدمہ سننے کے بعد فتویٰ دیا کہ:

عبد مسلم کم تر از احرار نیست

خون شہ رنگیں تر از معمار نیست

یہ فتویٰ سن کر بادشاہ نے اپنا ہاتھ کاٹے جانے کے لیے پیش کیا:

چوں مراد ایں آیہ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند[۳]
آیہ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیؐ بخشیدمش

یعنی قانون نے ہاتھ کاٹنے کے عوض میں ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دے دیا مگر خود مستغیث کو رحم آ گیا اور اس نے بدلہ نہیں لیا اور بادشاہ کو معاف کر دیا۔ آ گے چل کر میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق ایک پر درد باب لکھا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت حریت کی بنیاد رکھنے کے لیے اور ضمیر انسانی کا حق آزادی قائم کرنے کے لیے تھی:

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

اقبال نے ایک باب ہجرت پر لکھا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس میں معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ مقصود تو اس باب سے وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ملت اسلام کی بنیاد مذہبی یگانگت پر ہے اور یہ کسی خاص ملک یا وطن کی پابند نہیں، مگر اس باب میں مصنف نے اپنے دعوے پر ایک زبردست دلیل ہجرت نبوی کے مسلمہ واقعے سے پیدا کی ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ جو مکہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں جا بسے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ فی الحقیقت دشمنوں سے عاجز آ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس میں یہی حکمت چھپی تھی کہ اسلام کی عالم گیری کی بنیاد پڑے اور اسلام کے نام لیوا ہر جگہ اپنا وطن بنائیں اور وہاں نور اسلام پھیلائیں:

آں کہ در قرآن خدا او را ستود[۴]
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش

لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است

اس کے مقابل میں ملت کی بنا وطن پر رکھنے کا جو خیال ہے اور جس کے خلاف دلائل چند اشعار میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ان پر اس باب میں اقبال نے ایک اور دلیل اضافہ کی ہے اور وہ تمام انسانی اغراض کے لحاظ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف جغرافی قطعات میں سے ایک قطعہ بنائے ملت قرار پانے سے دنیا میں تنگ خیالی ایسی پھیلی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے اور دنیا میں جنگ و جدال کی کثرت ہو گئی ہے۔ گہری فلسفیانہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو عام بنی نوع انسان کو اس اُصول سے ضرور نقصان پہنچتا ہے، گو وہ محدود جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ قومیں بنی ہوئی ہیں، اس اُصول کی بدولت جلد ترقی کر جائیں۔ ان خیالات کو نظم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام[۵] ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس مسئلے سے کہ ملت اسلامی حدود مکانی کی پابند نہیں، قدرتی طور پر حدود زمانی کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے اور اس کے متعلق شاعر نے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملت اسلامی کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رومیاں را گرم بازاری نماند

آں جہاں گیری جہاں داری نماند
شیشہ ساسانیاں در خوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست
گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

اسلامیوں کو یہ بتانے کے بعد کہ ان کی ملت ان کے مذہب پر مبنی ہے اور اس کے دوام کا وعدہ ہو چکا ہے، ان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب جبھی ہوگا کہ وہ اپنے آئین کے پابند ہوں جو ان کی آسمانی کتاب یعنی قرآن شریف میں مندرج ہے۔ اس باب میں قران شریف کی تعریف خوب اشعار میں کی گئی ہے جن میں سے صرف دو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین

آگے چل کر مسلمانوں کو شرع کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے:

ہست دین مصطفیٰؐ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

اگر اس طرح باقی سب بابوں کا خلاصہ اس مختصر تبصرے میں درج کیا جائے تو شاید باعث طوالت ہوگا۔ شایقین اصل کتاب کو پڑھیں اور مستفید ہوں، مگر وہ تین بابوں کے خاص خاص اشعار کا ذکر کیے بغیر پھر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ ان میں ایک تو وہ باب ہے جس میں علم تاریخ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ترقی قومی کے لیے تاریخ دانی لازم ہے۔ یہ مضمون کیسے خوب صورت سلیس لفظوں میں ادا ہوا ہے:

ربط ایام است ما را پیرہن
سوزنش حفظ روایات کہن

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہٖ
داستانے، قصہٗ افسانہٗ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند

اس سے اگلا باب بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس میں عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جتایا گیا ہے کہ اچھے بیٹوں، بیٹیوں کی ماں بننا بڑے فخر کی بات ہے اور نوع انسان کے صنف نازک کا یہ سب سے بڑا فرض ہے۔ جدید زمانے میں اس فرض کی طرف جو بے توجہی کا میلان ہے وہ بہت نقصان دہ ہے۔ ایک گنوار اور بدوضع لڑکی، جو کسی نیک اور کارآمد شخص کی ماں بنتی ہے، اس نازنین گل اندام سے بہتر ہے جو اپنے اس اہم فرض سے بے پروا ہو یا اس ذمے داری کی متحمل ہونے کے نا قابل۔ اس پیغام کو تو حضرت اقبال سے انھی کے الفاظ میں سنیے:

آں دخ[۶] رستاق[۷] زادے جاہلے
پست بالائے، سطبرے[۸] بد گلے[۹]
نا تراشے، پرورش نادادۂ
کم نگاہے، کم زبانے، شادۂ
دل ز آلام اموت[۱۰] کردہ خوں
گرد چشمش حلقہ ہائے نیل گوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمان غیور و حق پرست
ہستی ما محکم از آلام اوست
صبح ما عالم فروز از شام اوست

رسول عربیؐ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نام مبارک اس سلسلے میں مسلمان عورتوں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی خوبیوں اور نیکی کے لحاظ سے رسول کریمؐ جیسے باپ کی پیاری بیٹی، حضرت علیؓ جیسے شوہر کی چہیتی بیوی اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ جیسے بیٹوں کی واجب التعظیم ماں بنیں اور اُنھوں نے اپنی زندگی میں مثال قائم کی کہ عورت ذات کس طرح اپنی زندگی کے ان تینوں مرحلوں پر اپنے فرائض کو ادا کرے کہ ساری ملت کے لیے بہتری کا باعث ہو۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شان میں جو اشعار اقبال کے قلم سے نکلے ہیں وہ اس دلی ارادت کے ترجمان ہیں جو اقبال کو رسولؐ اور آل رسولؐ سے ہے اور

ان میں یہ دو شعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ صفات کا ایک دریا ہے جو ایک ایک شعر کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر داد دیں گے اور جنھیں نہ معلوم ہو وہ صفحات تاریخ و سیر ملاحظہ کریں:

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز

آخری باب، جس میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ "قل هو الله احد" کی تفسیر ہے، خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا خاتمہ عرض حال مصنف پر ہوتا ہے جو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ راستے سے دور جا پڑے ہیں۔ ان کے ''شیخ''، ''برہمن'' سے زیادہ بت پرست ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے دماغوں میں بت چھوڑ مندر بھر گئے ہیں۔ جو صفات پہلے غیر مسلموں سے مخصوص تھیں وہ اُنھوں نے سیکھ لی ہیں۔ موت سے نہ ڈرنے کی بجائے ڈرنے لگے ہیں۔ عرب کی بجائے عجم کی تقلید میں مبتلا ہیں۔ دعا ہے کہ ان کو جو پیغام اس مثنوی کے ذریعے رہ حق کی طرف پھر آنے کے لیے دیا گیا ہے وہ با اثر ثابت ہو اور مقبول ہو۔

اخیر میں چند شعر شاعر نے اپنی ایک دلی آرزو کے اظہار میں لکھے ہیں اور ان میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان شعروں کا مزا اہلِ دل اور فدائیان نبیؐ لیں گے:

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانۂ
تا کجا زنجیریِ بت خانۂ
حیف چوں اور را سرآید روزگار
پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من

(ماہنامہ مخزن لاہور بابت ستمبر ۱۹۱۸ء)